ہدایت کے مطابق چلنا چاہیے۔ کیونکہ اسی پر عمل کرنے میں ہمارا مفر ہے۔ اکابر دین سے لے کر ذی اقتدار حاکم وقت تک جو زندگی کے مختلف شعبوں میں صاحبِ کمال مانے جاتے ہیں، انھیں کی حکومت کا سکہ برابر جاری رہتا ہے۔ اور وہی ہم پر برابر حاوی رہتے ہیں۔ لیکن جو گورنمنٹ یا جو اساتذہ رعب وداب سے کام لیتے ہیں وہ انسانی تعلقات میں ایسا ارتباط نہیں پیدا کرسکتے، جو سوسائٹی کی بہبودی کے لیے ضروری ہے۔

اگر ہمیں انسانوں میں مناسب باہمی تعلقات رکھنے منظور ہیں تو نہ تو جبر نہ ترغیب کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ حاکم اور محکوم میں سچی موانست اور باہمی اتحاد کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ اختیار اور اقتدار کے مسئلہ اور اس کے پیچیدہ اثرات و نتائج پر اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ اقتدار کی خواہش خود ہی کتنی تباہ کن ہے تو اس کی ساری حقیقت آپ سے آپ واضح اور روشن ہو جائے گی۔ اختیار اور اقتدار کو ترک کرتے ہی اشتراک کا حس پیدا ہو جاتا ہے، اور اسی صورت میں تعاون اور موانست ممکن ہے۔

تعلیم کے شعبے میں اصل مشکل مسئلہ تعلیم دینے والوں کا ہے۔ اگر استاد اقتدار اور قابو کو اپنی فطرت کے اظہار کا ذریعہ اور خود نمائی کو وسعت دینے کا ایک موقع خیال کرے تو طلبہ کی چھوٹی جماعت بھی اس کی ذاتی شہرت اور اہمیت کا وسیلہ ہو جائے گی۔ اختیار اور اقتدار کے تباہ کن

اثرات کو محض عقل و زبان سے تسلیم کر لینا بالکل فضول اور سراسر حماقت ہے۔ اقتدار و تسلط کی تہہ میں جو مخفی اغراض اور تحریکیں ہوتی ہیں، ان کو پہچاننے کے لیے گہری بصیرت ہونی چاہیے۔ اگر ہم یہ بخوبی سمجھ لیں کہ جبر سے عقل و دانش کبھی بیدار نہیں کی جاسکتی تو اس حقیقت کی آگہی سے ہمارے خوف کا خود بخود انسداد ہو جائے گا اور تب ہی ایسے نئے طرز کا ماحول پیدا کرنے میں ہم کوشاں رہیں گے، جو موجودہ سوشل نظام سے مختلف اور کہیں زیادہ بہتر ہوگا۔

زندگی کی اہمیت اور اس کے مصائب اور تکالیف کے سمجھنے کے لیے ہر قسم کے اثرات اور منظّم مذہبوں کے احکام سے اپنے آپ کو الگ رکھ کر غور کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر ہم بچے کو مدد دینے کی نیت سے اس کے سامنے مستند حوالے اور مثالیں پیش کرتے رہیں گے تو اس کی طبیعت میں خوف، نقل و تقلید کی خواہش اور طرح طرح کے توہمات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ جن اشخاص کا رجحان مذہب کی طرف ہوتا ہے، وہ اپنے بچوں پر ایسے خوف، عقائد اور امیدوں کو عائد کر دیتے ہیں جو انھوں نے اپنے والدین سے ورثہ میں پائے ہیں۔ اور جو مذہب کے خلاف ہیں، وہ بھی بڑے شد و مد سے اپنے بچوں پر یہ اثر ڈالنا چاہتے ہیں کہ وہ بھی اُن خاصِ طرز خیال کو قبول کریں، جن کے وہ خود پیرو ہیں۔ ہم سب یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے ہی طریق عبادت کو اختیار کریں، اور ہمارے